Al 1-211

اقبالؒ اور گوئٹے

وزیرزادہ محمد اشرف خان اشرف
بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ)

U891.41

قیمت :- دو۲ روپے

ناشر

ادبی دنیا اردو بازار دہلی ۶

انڈیا لیتھو پریس دہلی

891.4
A 319

GOVT. COLLEGE FOR WOMEN
TEXT BOOK LIBRARY
Acc No. 571
Date 14/5/65
SRINAGAR

A-31.9

تعارف

اقبال ایک فلسفی شاعر ہے اس لئے اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن تمام مسائل کو کماحقہٗ سمجھا جائے جو اُس کی شاعری کا موضوع ہیں۔

بدقسمتی سے اِن مسائل کے سمجھنے میں غلو سے کام لیا جارہا ہے اوّل تو ان مسائل کے مطالعہ میں اس بات کو قطعاً نظرانداز کردیا جاتا ہے کہ انھیں بیان کرنے والا محض ایک فلسفی نہیں شاعر بھی ہے، بلکہ اُس کا سب سے بڑا کارنامہ اُس کے فلسفیانہ تخیّلات نہیں اُن تخیّلات کی وہ شعری اور فنّی خوبصورتی ہے جو اُسے ایک فن کار کا مرتبہ عطا کرتی ہے۔ اس فلسفے کی گتھیاں سُلجھانے میں جو طریقِ عمل اختیار کیا

جاتا ہے وہ خود پیچیدہ مسائل سے کہیں بڑھ کر اُلجھا ہوا ہوتا ہے۔

فلسفے کی بحثوں سے لطف اندوز ہونا اور بات ہے۔ اور فلسفیانہ اشعار سے لذّت اندوز ہونا اور ہمیں اس وقت اس بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں کہ اقبال کے کلام کے موضوعِ سخن اور محاسنِ سخن دونوں لازم و ملزوم ہیں یا دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ حیثیت رکھتے ہیں۔ یا ایک کی اہمیت زیادہ ہے۔ اور دوسرے کی کم، ہمیں مطالعہ کرتے وقت دونوں کو متوازی رکھ کر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اب تک اقبال کے فنی کارناموں کا تذکرہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے یعنی اس کی شاعرانہ حیثیت، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اس کی فلسفیانہ شخصیت کے تلے دب کر رہ گئی ہے اور فلسفے کو اُبھارنے والوں نے اسے ایک معمّہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے مصنّف محمّد اشرف خان اشرؔف نے ان مسائل کا ایک ایسی سطح پہ رکھ کر مطالعہ کیا ہے جہاں وہ عام لوگوں کو واضح طور پر نظر آ سکتے ہیں۔

جناب اشرف کے اس مطالعہ کا ایک خاص زاویۂ نگاہ ہے اور وہ یہ کہ اُنہوں نے اقبال کے بنیادی خیالات کو مرکز بنا کر اس کے فارسی اور اُردو کلام کی تشریح کی ہے۔ یہ تمام اشعار اس مرکز سے اُسی طرح روشن اور واضح ہوتے ہیں جس طرح مرکز اُن اشعار سے زیادہ استوار اور محکم ہوتا جاتا ہے۔

کتاب کا عنوان "اقبال اور گوئٹے" اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے وہ اوّلین حیثیت رکھتا ہے اور اشعار کی توضیح ثانوی۔ اس طرح کی تصنیف کے لئے ضروری تھا کہ لکھنے والا ایک طرف تو اقبال کے فلسفیانہ موضوع سخن سے واقف ہو اور دوسری طرف فارسی زبان و شعر کو بخوبی سمجھتا ہو۔ خوش قسمتی سے جناب اشرف میں دونوں اوصاف پائے جاتے ہیں۔ فارسی زبان اُن کی مادری زبان ہے اور وہ اس کی لسانی اور شعری وسعتوں سے آشنا ہیں۔ پھر اقبالؔ کا مطالعہ اُن کا بچپن سے مشغلہ رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ وُہ اقبال کے وطن کشمیر سے وابستہ بھی ہیں۔ انہیں اس سرزمین سے محبّت بھی ہے اور وہ آج کل آزاد کشمیر کی سرزمین

کی خدمت میں مصروف ہیں۔ خاندانی طور پر ان کا تعلق گلگت کے وزیرزادوں سے ہے اور یہ سارا پس منظر اس کام کے لئے بے حد سازگار ہے۔

اس سازگار فضا میں اُن کے قلم سے بڑی سادہ لیکن کارآمد باتیں نکلی ہیں۔ اُمید ہے کہ ان باتوں کا مطالعہ ہمارے عام پڑھنے والوں اور بالخصوص اقبال کے پرستاروں کے لئے مفید ہو گا۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

کلامِ اقبال کے ماخذ

اقبال تلامیذ الرحمٰن میں سے ہونے کی حیثیت سے اکثر اپنے مضامین کتاب اللہ سے اخذ کرتے ہیں۔ "پیامِ مشرق" کے سرورق پر لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کی قرآنی آیت اور قصصِ انکارِ ابلیس واغوائے آدم اِس بات کے شاہدِ عادل ہیں۔ قرآن حمید کے بعد مثنوی مولانا روم ہی ایک ایسی کتاب ہے۔ جس کی نسبت یہ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ علاّمہ موصوف نے اس سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس بات کا اعتراف وہ خود اپنے کلام میں بارہا کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مرشد مولانا رومؒ کے احسانات کی طرف اشارہ کرکے وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

(۱) بیا کہ من زخمِ پیرِ روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی است

(۲) مطربِ غزلے بیتے از مرشدِ روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

غزلیہ کلام میں جیسا کہ بعد میں بالتفصیل بیان کیا جائے گا۔ اقبال نے سعدی و حافظ سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ ؎

تنم گُلے زخیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا زشیراز است

"ادب برائے ادب" کی نسبت اقبالؒ کا مطمحِ نظر

علامہ اقبال "ادب برائے ادب" کے قائل نہ تھے۔ اُن کی شاعری کا ایک نصب العین تھا۔ وہ خودی کی مشعل جلا کر زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں سے ہماری رہبری کر گئے ہیں۔ کیونکہ ایک نباضِ حکیم کی طرح حیاتِ انسانی کی دُکھتی رگوں سے وہ واقف ہو چکے تھے اور ہماری زندگیوں کی گہرائیوں میں ایک انقلابِ عظیم

لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن شعراء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کا مقصد شعر گوئی برائے شعر گوئی ہے۔ انہوں نے کیا خوب کہا ہے۔

زمن گو شاعرِ رنگیں بیاں را
چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود را می گدازی زآتشِ خویش
نہ شامِ دردمندے بر فروزی

اقبالؒ بحیثیت عاشقِ رسول اللہؐ

میری نظر میں اقبال مرحوم کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز اُن کا سچّا عشقِ رسولؐ ہے اور اسی عشق کی بدولت اُن کے کلام میں اس قدر فراوانیٔ تخیّل و لذت موجود ہے۔ جب وہ حدیثِ عشق بیان کرتے ہیں تو خود سراپا نغمہ بن جاتے ہیں اور مئے عشقِ رسولؐ سے یکسر مخمور ہو کر حقائق و معارفِ زندگی کے وہ دریائے معانی بہا دیتے ہیں کہ باید و شاید۔ زیرِ نظر کتاب میں سب سے پہلے اُن کا روئے سخن امیر امان اللہ خاں سابق تاجدارِ افغانستان

سے ہوتا ہے۔ جہاں وہ امیر موصوف کے لئے بلکہ ہر ایک حکمرانِ ملّتِ بیضا کے لئے پند و نصائح کا ایک بے پایاں دفتر کھول دیتے ہیں۔ وہاں عشقِ رسُول کا تذکرہ کئے بغیر اُن سے رہا نہیں جاتا۔ رہا بھی کیسے جاتا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

ہر کہ عشقِ مُصطفےٰ سامانِ اوست — بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب — ذرّۂ عشقِ نبی از حق طلب
زانکہ ملّت را حیات از عشقِ اوست — برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست
جلوۂ بے پردۂ او وانمود — جوہرِ پنہاں کہ بود اندر وجود
رُوح را جز عشقِ او آرام نیست — عشقِ او روزیست کو را شام نیست

زیرِ نظر کتاب کے علاوہ مثنوی رموزِ بیخودی میں بعنوان عرضِ حالِ مصنّف بحضور رحمتہ للعالمین جو نظم لکھی ہے۔ اُس میں علاّمہ مرحوم نے اپنے عشق و تعلقِ رسول کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ یہاں چند

اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

از پدر تا نام تو آموختم — آتش ایں آرزو افروختم

تا فلک دیرینہ تر سازد مرا — در قمارِ زندگی بازد مرا

آرزوئے من جواں تر میشود — ایں کہن صہبا گراں تر میشود

ایں تمنا زیر خاکم گوہر است — در شب تارم ہمیں یک اختر است

مدّتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغِ عافیت داماں زدم

برقہا رقصید گرد حاصلم — رہزناں بردند کالائے دلم

ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت

ایں زرِ سارا زداما نم نہ ریخت

(ماخوذ از اسرار و رموز بیخودی)

اسی کتاب میں آگے چل کر اسلام کے نامور سپاہی مصطفیٰ کمال پاشا رحمتہ اللہ سے مخاطب ہوتے ہوئے رسوؐل اللہ کا ذکر جمیل وہ سب سے پہلے کرتے ہیں ؎

اُمّیٔ بود کہ ما از اثر حکمت او
واقف از سرِ نہاں خانۂ تقدیر شدیم

علامہ موصوف اپنی ایک دلآویز غزل میں خدا اور رسُول کی نسبت صاف صاف الفاظ میں اپنے خیال کو یوں بیان کرتے ہیں۔

ـہ با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من

میں اپنے مطالعہ کی بنا پر اگر یہ رائے قائم کرلوں کہ مشاہیر شعرائے فارس میں سے رئیس العاشقین مولانا جامیؒ اور حضرت شیخ شیراز سعدی رحمتہ اللہ علیہ عشقِ رسول میں سب پر گوئے سبقت لے گئے اور ہمارے اُردو شاعروں میں سے اقبال مرحوم کو قدرت نے سب سے زیادہ اس دولتِ جاوید سے سرفراز

۱ؔ نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت ۔ بہ غمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد۔ (حافظؒ)

۲ؔ یا صاحب الجمال و یا سید البشر — من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ — بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
(جامیؒ)

کیا۔ تو میں حق بجانب ہوں گا۔ کیوں کہ سعدی جیسے عجمی النسل شاعر نے اسی مئے عشق رسول ﷺ کے خمار میں ہی وہ فقید المثال قطعہ کہدیا تھا۔ جس کی سلاست و بلاغت زبان کے آگے تمام عربی شعراء کو سپر ڈال دینا پڑی اور مؤخر الذکر جیسے ہندی النسل شخص نے وہ نکات اسلام بیان کردیے کہ عرب و عجم استعجاب میں پڑ گئے۔

اقبالؔ کا نظریۂ قومیّت و وطنیّت

علامہ اقبالؔ نے اپنے نظریۂ وطنیت کو اپنی نظم "الملک للہ" کے فصیح و بلیغ الفاظ میں بخوبی بیان کیا ہے یعنی وہ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست" کے قائل تھے چنانچہ اسلام اور قومیّت و وطنیت کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں :۔

اقبال اور قومیت :۔ "جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

اس کی رُو سے اسلام محض انسانوں کی اخلاقی اصلاح کا داعی ہی نہیں۔ بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا جیسے مصریوں اور یونانیوں کا بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ بھی تعلیم دی۔ کہ دین انفرادی اور ذاتی ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث ہوئی کہ دین چوں کہ ذاتی عقائد کا نام ہے۔ اس لئے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف ریاست ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے۔ نہ نسلی نہ انفرادی اور نہ ذاتی۔ بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو منظم کرنا ہے۔ اب دستور العمل قوم اور نسل پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کو ذاتی کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق کار ہے۔ جس سے عالم انسانی کی

جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک اُمّت کی تشکیل اور اس کی بقاء کے لئے ضروری ہے"!

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

اقبالؔ اور وطنیّت: "میں نظریۂ وطنیّت کی تردید اس زمانہ سے کر رہا ہوں۔ جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی میں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیّت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب ہو گئی۔ کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" یہ بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف منسوب ہوئے چلے آئے ہیں۔ چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ کا لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کی حدود آج کچھ ہیں۔ کل کچھ۔

کل تک برما ہندوستان میں تھا۔ ان معنوں میں انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبّت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اِس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہے وطن کی محبّت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم جغرافیائی نہیں۔ بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ کا۔ اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصوّر کے طور پر استعمال کیا جائے۔ تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے"۔

علاّمہ اقبالؔ کو اپنے آبائی وطن جنت ارضی سرزمین کشمیر سے والہانہ اُلفت تھی۔ جیساکہ اُن کے کلام سے جا بجا مترشح ہے کشمیر کے وہ چشم فریب مناظر جو ڈل کے کنارے تماشائیوں کی بے تاب نگاہوں کو دعوت نظارہ دیتے ہیں، کس خوش اسلوبی سے انہوں نے اپنی ایک ہی نظم کشمیر میں سمویا ہے ؎

کشمیر

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نار دن نگر

تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہرِ فتنہ باز
بستہ بچہرۂ زمین برقعِ نسترن نگر!

لالہ ز خاک بر دمید موج با بجو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر!

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

وہ اپنے آبائی وطن میں جا کر اپنے بزرگوں کی یادگاریں تلاش کرتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں ؎

سرت گردم اے ساقیٔ ماہ سیما بیار از نیاگانِ ما یادگارے

کشمیر کی تعریف میں یوں تو بیسیوں شعرا رطب اللسان ہیں لیکن گیا کسی سے اتنی مختصر مگر جامع تعریف بن پڑی ہے جو اقبالؔ مرحوم

کے ان اشعار میں پنہاں ہے۔

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را — نہادست در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگان را! — رہا سازد و از محنتِ انتظارے

اور جہاں شاعر اس بہشتِ ارضی میں "باغ نشاط" کے پُرکیف مناظر گل و ریحان اور جوئبار و آبشار سے لطف اندوز ہوتا ہے وہاں اس میں بسنے والے ضعیف الاعتقاد اور قابلِ رحم انسانوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر نوا سنج ہوتا ہے:۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے — نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

وہ نہ صرف نقشہ کھینچنے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ بلکہ خدائے عزّ و جل سے التجا کرتا ہے ؎

ازاں مئے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

"لالۂ طور"

"پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
گفتا مئے کہ تلخ ترا او نکو تراست"
اقبالؔ

لالۂ طور

اقبالؔ نے اپنے کوزہ "لالۂ طور" میں حقائق و معارف زندگی کا ایک بحرِ بے کنار بند کر دیا ہے، یا یوں کہیے کہ خودی کی مشعل جلا کر زندگی کے مشکل ترین مسائل کو عریاں کر کے ہمیں دعوت عمل دی ہے بیقراری۔ سوز و ساز۔ تب و تاب۔ سبزہ خوئی۔ دشوار پسندی اور انقلابِ پیہم اُن کے نزدیک زندگی بخش خصائل ہیں۔ ان کے بغیر حیات موت کے مترادف ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر وہ جادو نگار، رنگیں بیان شاعریوں گوہر افشاں ہوا ہے۔

بیقراری

دریں دریا چو موج بے قرارم
اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار مجھے
سحر کو ہوں جو برہمن تو شام کو محمود (جوشؔ ملیح آبادی)

آگے چل کر "افکار" میں وہ اسی خیال کو یوں بیان کرتا ہے :-

خنک انسان کہ جانش بیقرار است
سوارِ راہوارِ روزگار است
قبائے زندگی بر قامتش راست
کہ او نو آفرین و تازہ کار است

تب و تاب

شنیدم در عدم پروانہ مے گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش

(ا) پریشاں کن سحر خاکسترم را
و لیکن سوز و ساز یک شبم بخش

(ب) تپش مے کند زندہ تر آدمی را
تپش مے دہد بال و پر آدمی را

(ج) نشود نصیبِ جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تابِ زندگانی بتو آشکار بادا

سوز و ساز

زندگی سوز و ساز بہ سکون دوام
فاختہ شاہیں شود از اثرِ زیر دام

ستیزہ خوئی

بدریا غلط دبا موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

دشوار پسندی (ا)

مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

(ب) من آں پروانہ را پروانہ گویم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

(ج) بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

(د) ولیکن من رانم کشتئ خویش
بدریائے کہ موجش بے نہنگ است[1]

علاوہ ان حقائق و معارفِ زندگی کے اور بھی بیسیوں مسائلِ حیات

---

[1] مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک (ضربِ کلیم)

پر علامہؒ نے زیر نظر تصنیف "پیامِ مشرق" میں نہایت حکیمانہ رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔ اقبالؔ تقلید کے سراسر دشمن تھے۔

(ا) اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہے اجداد رفتے

(ب) تراش از تیشۂ خود جادہ خویش
براہے دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

تنازع للبقاء و جہد للحیات کے لئے شاعر کے خیال میں ایک مضبوط و مستحکم جسم کی اشد ضرورت ہے۔ جس کے لئے وہ ہر شخص کو کوشاں رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

تنے پیدا کُن از مُشتے غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دِل درد آشنائے
چو جوئے در کنارِ آبشارے

ایک شاعر کی عزیز ترین متاع اس کے نغمات شیریں ہؤا کرتے ہیں۔ اگرچہ ان نغموں کے پیدا کرنے میں اُسے اسی طرح ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح ایک ماں کو بچّہ جنتے وقت تکلیف ہوتی ہے۔ بقول کسے ؎

خشک سیرو دل تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اِک مصرعۂ تر کی صورت

اور بقول اقبالؒ ؎

برگِ گُل رنگیں ز مضمون من است
مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است

لیکن جس طرح ایک ماں اپنے بچّے کی مامتا میں مگن ہو کر اپنے عیش و آرام کو بھی بھول جاتی ہے۔ اُسی طرح اقبالؒ جیسا ایک حقیقی شاعر اپنے سرمدی نغموں کے کیف میں یکسر کھو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو شاعر نے اپنے رنگیں پیرایہ میں یوں بے نقاب کیا ہے ؎

مرا ایں نالہ ہائے دمبدم بہ	سخن در دو غم آرد، درد و غم بہ
نوائے دلکشے از ملکِ جم بہ	سکندر راز عیشِ من خبر نیست

بقائے زندگی کے راز کو جنگ کی ظاہرہ تباہ کُن ہولناکیوں میں ہی مضمر پاکر فلسفۂ حیات کے ہمارے ژرف نگاہ شاعر نے اس سے کنارہ کشی کرنا مضرت رساں قرار دیا ہے اور اس مسئلہ میں اس کے تخیلات[1] اسلام کے ارشادات کی ترجمانی کر رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت | شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی | بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

شکوک میں پڑنے کے بغیر تحصیل علم ناممکن ہے۔ یقین محکم کے بدوں عمل میں خامی رہتی ہے اور حصولِ مقصد کے لئے یکسوئی لازم ہے۔ شاعر نے اس حقیقت کو کس خوبی سے واضح کر دیا ہے۔

ہُمائے علم تا افتد بدامت
یقیں کم کُن، گرفتارِ شکے باش
عمل خواہی یقیں را پختہ تر کن
یکے جوئے و یکے بین و یکے باش

---

[1] مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ | مصلحت در دین عیسےٰ غار و کوہ

[2] لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي دِينِ الْإِسْلَامِ | (اسرار خودی)

شاعرِ عالمگیر اخوّت انسانی کا درس جابجا اپنے کلام میں دیتا ہے اور امتیازاتِ رنگ و بو اور ملک کے خلاف آواز بلند کرتا ہے وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ اقبالؔ کی شاعری ایک خاص گروہ انسانی کے لئے مفید ہے۔ صریحاً غلطی پر ہیں۔ شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار اُن کے اِس خیال باطل کی تردید کرتے ہیں:۔

(ا) ہنوز از بند آب و گل نہ رستی | تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بوئیم | ازاں پس ہندی و تورانیم من

(ب) نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

علّامہ مرحوم کسی اور مقام پر بھی اسی خیال کے زیرِ اثر کہتے ہیں:۔

برنگ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر ترک عرب کُن

عام عجمیوں کو جمود و قنوط سے اور مسلمانوں کو خواب سے بیدار کرنے میں اقبالؔ کے افکارِ عالیہ بہت حد تک کارفرما رہے ہیں:۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدائے من درائے کاروان است
حُدی را تیز تر خوانم چو عُرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

بزدل انسانوں کے لئے ہوا کا لطیف جھونکا بھی تُند و تیز طوفان باد و باراں سے کم نہیں ہے اپنے وساوس بیجا و خوف و ہراس باعث وہ اپنی مقررہ موت سے کئی بار پہلے مر چکے ہیں۔ برعکس اس کے بہادر انسانوں کے سامنے جنگل کا بادشاہ شیر بھی ایک پالتو بھیڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور وہ اپنی زندگیوں میں صرف ایک ہی دفعہ مرتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی اس خصلت پر حکیم مشرق نے یوں نوا سنجی کی ہے:۔

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است
دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است

---

(1) Cowards die many times before their deaths
The Valiant never taste of death but once
Stars to me are Sun light steady (Shakespeare)
Cowards only feel, 'tis night (Goethe)

اگر بیمے نداری بجر صحرا است
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

انسان جب کسی کام کا مصمم ارادہ کرتا ہے۔ اور جذبۂ ذوق و شوق[1] اپنے دل میں پیدا کر کے سرشار ہوتا ہے تو بڑے بڑے کام کر جاتا ہے اور اُسے کٹھن سے کٹھن منزل گلگشت نظر آنے لگتی ہے۔ اس رازِ پنہاں کو ترجمانِ حقیقت نے کس شانِ دلآویزی سے بے نقاب کیا ہے:-

مگو از مدعائے زندگانی ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوق سفر آنگونہ مستم کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

زیرِ نظر تصنیف میں علامہ اقبالؒ نے ہمیں اپنی دنیائے دِل کو آباد کرنے کی بار بار تلقین کی ہے۔ بڑے بڑے سر بفلک منادر و مساجد کی تعمیر پر فخر کرنا محض بیکار ہے جبکہ انسان اپنے جسم کے اندر چند قطروں پر خانۂ دِل آباد نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ لالۂ طور میں ارشاد ہوتا ہے:-

---

[1] کاریکہ کردہ ام بجہاں، گر خطا نہ شُد شوقِ وصالِ یار مرا تازیانہ شُد
(اشرف)

کنشت و مسجد و بُت خانہ و دیر
جُز ایں مُشت گِلے پیدا نہ کردی
ز حکم غیر نتواں جز بہ دل رست
تُو اے غافل دلے پیدا نہ کردی

اُن کے نزدیک ایک صاحب دل کی قدر و منزلت ایک صاحب مال و متاع سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے:۔

تو اے دِل تا نشینی در کنارم
ز تشریف شہاں خوشتر گلیم
درونِ سینہ ام باشی پس از مرگ
من از دست تو در امید و بیم

دِل کی تعریف میرے خیال میں ابتک زبان شعر میں اقبالؒ سے بہتر انداز میں کسی شاعر سے نہیں ہو سکی ہے۔

مندرجہ ذیل غزل میں علاّمہ مرحوم نے کس خوبی سے مختلف وارداتِ قلب کو نہ صرف یکجا جمع کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی دکھایا ہے۔ کہ ایک صاحبِ دل انسان اس معرکۂ کون و فساد میں جس کا نام

دُنیا ہے یا بقول اقبالؒ

ایں تیرہ خاک داں کہ جہاں نام کردہ اند

فرسودہ پیکرے ز صنم خانۂ دل است

کیا کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اب وہ غزل ملاحظہ ہو:۔

سوزِ سخن زنالۂ مستانہ دل است[1]

ایں شمع را فروغ ز پروانۂ دِل است

---

[1] اُردو میں بھی بعنوان "دل" ایک پوری نظم لکھی ہے۔ جو یہاں درج کی جاتی ہے۔ غالباً یہ نظم "پیام مشرق" کی غزل سے پہلے لکھی گئی تھی۔

"دِل"

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل!
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دِل

یارب! اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملک بقا ہے خطِ پیمانۂ دِل

ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دِل

حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دِل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کیسی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دِل

دل پہ ہے جنوں اور مجھے سودا پلا
دلِ کسی اور کا دیوانہ ہیں دیوانۂ دِل

تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو
رشک صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دِل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دِل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

(بانگِ درا)

مشتِ گلیم و ذوقِ فغانے نداشتیم
غوغائے ما ز گردشِ پیمانۂ دِل است

ایں تیرہ خاک داں کہ جہاں نام کردہ اند
فرسودہ پیکرے ز صنم خانۂ دِل است

اندر رصد نشستۂ حکیم ستارہ بیں
در جستجوئے سرحدِ ویرانۂ دِل است

لاہوتیاں اسیرِ کمندِ نگاہِ او
صوفی ہلاکِ شیوۂ ترکانۂ دِل است

محمُود غزنوی کہ صنم خانہا شکست
زنّاریٔ بتانِ صنم خانۂ دِل است

غافل ترے ز مرد مسلماں ندیدہ ام
دِل در میان سینۂ و بیگانۂ دِل است

اقبال کے ان تخیلات عالیہ کو پڑھنے کے بعد غالب کے یہ اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں۔ تاکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی نظر آ سکے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

بساطِ عجز میں اک دل ہے ایک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

خطراتِ عظیم میں پڑنے کے بغیر کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ عروج ہمیشہ مشکلات و خطرات کا سامنا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو کس خوبی سے علامہ نے اپنی نظم موسوم بہ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" میں بیان کیا ہے اس نظم کا مقطع آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے ؎

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکنات جسم و جان است

انفرادی عروج خواہ کیسا ہی شاندار کیوں نہ ہو۔ ہمارے شاعر کے خیال میں ملک و ملت کی اجتماعی ترقی کے آگے ایک نہایت ہی ناپائیدار و بے حقیقت شے ہے ؎

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
خراج خسروان و گنج یم رفت

اُمم را از شہاں پائندہ تر داں
نمے بینی کہ ایراں ماند و جم رفت

بقول "اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد"
عموماً شعراء کی قدر دانی اُن کے مرنے کے بعد کی جاتی ہے۔

اور اپنی زندگی میں وہ بے قدری زمانہ کے اکثر شاکی رہتے ہیں۔ چنانچہ فردوسی کے ساتھ زمانہ نے جو ناروا سلوک کیا۔ وہ ایک تاریخی واقعہ ہو چکا ہے۔ لیکن اقبال مرحوم ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں۔ جن کو اپنی زندگی میں ہی عالمگیر شہرت نصیب ہوئی ہے

عجم از نغمۂ ہائے من جواں شُد

زسودایم متاعِ او گراں شُد

برّ عظیم ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی موجودہ بیداری کے اسباب و علل پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ جہاں سرسیّد احمد خاں مرحوم کی قائم کردہ مسلم یونیورسٹی اور جمال الدین افغانی کے تاثرات و افکار کارفرما رہے ہیں۔ وہاں اقبال کے نغمات کو بھی بہت دخل رہا ہے۔ وہ اصحاب جنہوں نے علاّمہ مرحوم کے نغمات موسوم بہ "شکوہ" و "جواب شکوہ" کو پڑھا ہو گا۔ مجھے اُمید ہے کہ انہیں میری رائے سے اتفاق ہو گا۔ ڈاکٹر سیّد محمود اپنی کتاب ہندو اور مُسلمان

لے وجود افراد کا مجازی، ہے ہستئ قوم ہی حقیقی

فدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا (بانگ درا)

میں ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؒ کی تعلیمات کے بارے میں رقمطراز ہیں۔
"اقبال کی تعلیمات کا مسلمانوں پر اس قدر اثر پڑا ہے کہ اقبال کے خیالات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ابتدا میں اقبالؒ کے خیالات خالصتاً قوم پرستانہ تھے، اُن کے دل میں سارے ہندوستان کا درد تھا اور سارے ملک کی ترقی کی لگن تھی۔ انہوں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے دیش بھگتی کے خیالات کو اردو کے حسین سانچوں میں ڈھال دیا۔ نیا شوالہ۔ ہندوستان ہمارا۔ رام ان نظموں نے ہندوؤں اور مسلمانوں پر گہرا اثر ڈال دیا۔ لیکن آگے چل کر اقبالؒ کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور قوم پرستی کے جوش کا پہلا اُبال اُن کے دماغ سے نکل گیا۔ پھر ذرا گہری فکر کا وقت آگیا۔ اس دور میں دو محرکات ملے۔ جن میں ایک ذریعہ اسلامی دنیا اور اس کے مفکرین تھے۔ ابو سینا، ابن رشد، غزالی، جمال الدین افغانی اور ترکی رہنماؤں کی طرف اقبالؒ کا دھیان رہا۔ جنہوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی کہ وہ اپنے کندھوں سے یورپینوں کا جوا اُتار پھینک دیں۔

اور اپنی پرانی عظمت و شوکت کو واپس لے آئیں۔

بہر حال مسلمانوں کے درخشاں ماضی کی طرف لوٹنے کے خیال میں اقبال کو بڑی کشش معلوم ہوئی اور پھر ہندو راج کی ذہنیت نے انہیں قوم پرستی کے راستے سے اور پرے ہٹا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کی شاعری میں طاقت کی پوجا ہونے لگی اور ان کا فلسفہ احیائے اسلام کے تخیل کے نشو و نما میں لگ گیا۔ پچیس سال تک اقبال کی ساحرانہ شاعری اور مسخر کر دینے والے خیالات سے مسلمانوں کا دماغ متاثر ہوتا رہا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مسلمان نیند سے جاگ اُٹھے اور اُن کا یہ خیال جاتا رہا کہ وہ کسی قابل نہیں اور کچھ نہیں کر سکتے"۔

مسلمانوں کی دکھتی رگ کو پکڑ کر اور ایک کامیاب جراح کی طرح جراحی کر کے علامہ مرحوم کہتے ہیں ؎

رگِ مسلم ز سوزِ من تپیداست
ز چشمم اشک خونابہ چکیداست

اس عالمِ فانی کی تعریف یوں تو دیگر شعراء نے بھی اپنے اپنے

پیرایہ میں بیان کی ہے۔ چنانچہ عمرِ خیام اسے "رباط کہن" کے نام سے یاد کرتا ہے ؎

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است
آرام گہِ ابلق صبح و شام است

لیکن ہمارے شاعر نے جو تعریف کی ہے وہ سب تعریفوں سے بدرجہا افضل ہے۔

بزمے است کہ شیرازۂ او ذوقِ جدائی است

"مۓ باقی"

من ایں مۓ از مغانِ دورِ پیشیں
ز چشمِ مستِ ساقی دام کردم
اقبالؔ

مے باقی

"مے باقی" کے تحت اقبالؒ نے اپنی بہترین فارسی غزلوں کے مجموعہ کو پیش کیا ہے۔ ان غزلیات میں سے اکثر و بیشتر حافظؔ و سعدیؔ کے کلام کے تتبّع میں کہی گئی ہیں۔ ایسی غزلیں "مے دو آتشہ" کے تحت لسان الغیب اور استادِ غزل سعدیؔ کی غزلوں کے بالمقابل درج کر کے پیش کی جاتی ہیں تاکہ اربابِ ذوق ان کے ملاحظہ سے لطف اُٹھائیں۔

محاکمہ سے ثابت ہے کہ حافظؔ اور سعدیؔ کی غزلوں کا اندازِ بیان اقبالؔ کی غزلوں سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے

در شعر سہ تن پیمبر آنند
ہر چند کہ لا نبیَّ بعدی

ابیات و قصیده و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

"مے دو آتشہ"

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است
کہ شعرِ حافظِ شیراز بہ ز شعرِ ظہیر

غزل ترجمانِ حقیقت علاّمہ اقبالؒ

(۱)

بشاخِ زندگی ما نمے ز تشنہ لبی است
تلاشِ چشمۂ حیواں دلیل کم طلبی است

حدیثِ دل بہ کہ گویم چہ راہ برگیرم
کہ آہ بے اثر است و نگاہ بے ادبی است

غزل بزمزمۂ پردہ پست تر گرداں
ہنوز نالۂ مرغاں نوائے زیر لبی است

متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بردند
ولے زباں نکشائی کہ یار ما عربی است

نہال ترک ز برق فرنگ بار آورد
ظہور مصطفوی را بہانہ بولہبی است

مسنج معنیٔ من در عیارِ ہندو عجم
کہ اصل ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است

بیا کہ من ز خمِ پیر روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

غزل لسان الغیب خواجہ حافظ بلبل شیراز!

(۱) اگرچہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی است
زباں خموش ولیکن دہاں پر از عربی است

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمۂ ناز!
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

سبب مپرس کہ چرخ از چہ سفلہ پرور شُد
کہ کار بخشی او را بہانہ بے سببی است

ازیں چمن گُل بے خار کس نچید آرے
چراغ مصطفوی با شرار بولہبی است

حسن ز بصرہ بلال از حبش سہیل از شام
زخاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی است

جمالِ دختر رز نور چشم ماست مگر
کہ در نقاب زجاجی و پردۂ عنبی است

دوائے درد خود اکنوں ازاں مفرح جوئے

کہ در صراحیِ چینی و شیشۂ حلبی است

بہ نیم جو نخرم طاقِ خانقاہ و رباط

مرا کہ مصطبہ ایوان و جائے خم طلبی است

ہزار عقل و ادب داشتم من اے خواجہ

کنوں کہ مست و خرابم صلائے بے ادبی است

غزل ترجمان حقیقت علامہ اقبالؒ

(۲) سر خوش از بادۂ تو خم شکنے نیست کہ نیست

مست لعلین تو شیریں سخنے نیست کہ نیست

در قبائے عربی خوشترک آئی بہ نگاہ

راست بر قامت تو پیرہنے نیست کہ نیست

گرچہ لعل تو خموش است و لے چشم ترا

با دل خوں شدۂ ما سخنے نیست کہ نیست

تا حدیث تو کنم بزم سخن می سازی

ورنہ در خلوت من انجمنے نیست کہ نیست

اے مسلماں دگر اعجاز سلیماں آموز

دیدہ بر خاتم تو اہر منے نیست کہ نیست

غزل لسان الغیب خواجہ حافظ بُلبُلِ شیراز

(۲) روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست

منت خاک درست بر بصرے نیست کہ نیست

ناظرے روئے تو صاحب نظر آنند و لے

سر گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

اشک غماز من از شرح بر یدچہ عجب

خجل از پردۂ خود پردہ درے نیست کہ نیست

کمر گیس من خستہ چہ بندی کہ ز ہمر

بر میان دل و جانم کمرے نیست کہ نیست

من ازیں طالع شوریدہ بر نجم ورنہ

بہرہ منداز سر کوئے تالبشر ے نیست کہ نیست

بجز ایں نکتہ کہ حافظ ز تو ناخوشنود است

در سراپائے وجودت ہنرے نیست کہ نیست

غزل ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال ؒ

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست

گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست

بخواب رفتہ جواناں دمُردہ دلِ پیراں

نصیب سینہ ہر کس آہ صبح گاہے نیست

بایں بہانہ بدشتِ طلب ز پا منشیں

کہ در زمانہ ما آشنائے راہے نیست

ز وقت خویش چہ غافل نشستہ دریاب

زمانہ کہ حسابش ز سال و ماہے نیست

دریں رباطِ کہن چشم عافیت دارد

ترا بکشمکش زندگی نگاہے نیست!
گناہ را چہ نویسند کاتبانِ عمل
نصیب ما زجہانِ تو جز نگاہے نیست
بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم
کہ او زخرقہ فروشانِ خانقاہے نیست

غزل لسان الغیب خواجہ حافظؒ بلبل شیراز

(۳) جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست
سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست
عدو چو تیغ کشد من سپر بیند ازم
کہ جرم ما بجز از نالہا دآہے نیست
چرا ز کوئے خرابات روئے برتابم
کزیں رہم بجہاں ہیچ رسم وراہے نیست
زمانہ گر بزند آتشم بخرمنِ عمر
بگو بسوز کہ بر من ببرگ وکاہے نیست

غلام نرگسِ چشمانِ آں سہی سروم
کہ از شرابِ غرورش بکس نگاہے نیست

مباش در پے آزار و ہرچہ خواہی کُن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

عقابِ جور کشادہ است بال در ہمہ شہر
کمانِ گوشہ نشینی و تیر آہے نیست

چنیں کہ در ہمہ سو تیرہ راہ مے بینم
بہ از حمایتِ زلفِ توام پناہے نیست

خزینۂ دلِ حافظ بزلف و خال مدہ
کہ کارہائے چنیں حدِ ہر سیاہے نیست

غزل اقبالؔ

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند (۴)
ہمیں بس است کہ آئینِ چاکری داند

نہ ہر کہ طوفِ بتے کرد و بست زنّارے
صنم پرستی و آدابِ کافری داند

ہزار خیبر و صد گونہ اژدر است اینجا
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند

بعشوہ ہائے جوانانِ ماہ سیما چیست
در آ بحلقۂ پیرے کہ دلبری داند

فرنگ شیشہ گری کرد جام مینا ریخت
بحیرتم کہ ہمیں شیشہ را پری داند

چہ گو نمرت زمسلمان نامسلمانے
جز ایں کہ پور خلیل است و آذری داند

شبے بہ غمکدۂ من گذر کُن و بنگر
ستارہ سوختۂ کیمیا گری داند

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

غزل حافظؒ

(۴) نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

ہزار نکتۂ باریک ترز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

در آب دیدۂ خود غرقہ ام چہ چارہ کُنم
کہ در محیط نہ ہر کس شناوری داند

غلام ہمّت آں رندِ عافیت سوزم
کہ در گدا صفتے کیمیا گری داند

سوادِ نقطۂ بینش زحال تُست مرا
کہ قدرِ گوہر یک دانہ گوہری داند

بیا ختم دل دیوانہ و ندانستم
کہ آدمی بچۂ شیوۂ پری داند

بقدر چہرہ ہر آنکس کہ شاہ خوباں شد

جہاں بگرد اگر داد گستری داند
وفائے مہر نکو باشد ار بیاموزی
وگرنہ ہر کہ تو بینی ستم گری داند
تو بندگی چو گدایانِ شرطِ مزد مکُن
کہ دوست خود روشِ بندہ پروری داند
زشعر دلکش حافظ کسے شود آگاہ
کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند

محاکمۂ غزلیاتِ سعدیؒ و اقبالؒ

اُستادِ غزل سعدیؔ است پیشِ ہمہ کس امّا
دارد سخنِ حافظؔ طرزِ سخنِ خواجو
(حافظؔ)

استادِ غزل شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رح

از جاں بروں نیامدہ جانانت آرزوست
زنّار نابریدہ و ایمانت آرزوست

بروز گہے کہ نوبتِ ارنی ہمی زنند
مورے نۂ و ملک سلیمانت آرزوست

مردے نۂ و خدمت مردے نکردۂ
وآنگاہ صف صفہ مردانت آرزوست

فرعون وار لاف انالحق ہمے زنی!
وآنگاہ قرب موسیٰ عمرانت آرزوست

چوں کودکاں کہ دامن خود اسپ مے کنند
دامن سوار گشتہ و میدانت آرزوست

انصاف راہ خود ز سر صدق دادۂ
بر درد نارسیدہ و درمانت آرزوست

برخوان عنکبوت کہ بریاں مگس بود

شہپر جبرئیل مگس رانت آرزوست
ہر روز از برائے سگ نفس بوسید
یک کاسہ شور باد دونانانت آرزوست
سعدی دریں جہاں کہ توئی ذرّہ وار باش
گر دل بنزد حضرت سُلطانت آرزوست

علّامہ شیخ محمّد اقبالؒ رحمتہ اللہ علیہ

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلک شبیرم آرزوست
از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر !!
باز ایں نگر کہ شعلہٗ در گیرم آرزوست
گفتند لب بہ بند و ز اسرار ما مگو
گفتم کہ بے حجابیٔ تقدیرم آرزوست
از روزگار خویش ندانم جز ایں قدر

خوابم ز یاد رفت و تعبیرم آرزوست
کو آں نگاہ ناز کہ او دل ولم ربود !
عمرت دراز باد ہماں تیرم آرزوست

غزل شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است
برادرانِ طریقت نصیحتم مکنید
کہ توبہ دَر رہ عشق آبگینہ و سنگ است
دگر بخفیہ نمیبایدم شراب و سماع
کہ نیک نامی در دین عاشقان ننگ است
چہ تربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم
مرا کہ چشم بساقی و گوش بر چنگ است
بیاد گار کسے دامن نسیم مباد

گرفته ایم و دریغا که باد در چنگ است
بچشم رفتهٔ ما را که میبرد پیغام
بیا که ما سپر انداختیم اگر جنگ است
ملامت از دل سعدی فرو نشوید عشق
سیاهی از حبشی چوں رود که خود رنگ است

غزل از شیخ محمدؒ اقبال رحمتہ اللہ علیہ

بیا که ساقیٔ گل چہرہ دست بر چنگ است
چمن ز باد بہاراں جواب ارژنگ است
حنا ز خون دلِ نو بہار می بندد
عروسِ لاله چه اندازه تشنهٔ رنگ است
نگاه می رسد از نغمهٔ دل افروزے
بمعنیٔ که بر و جامهٔ سخن تنگ است
بچشمِ عشق نگر تا سراغ او گیری

جہاں بچشم خرد سیمیا و نیرنگ است

زِ عشق درس عمل گیر و ہرچہ خواہی کُن

کہ عشق جوہر ہوش است و جان فرہنگ است

بلند تر ز سپہر است منزل من و تو

براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است

زِ خود گذشتۂ اے قطرۂ محال اندیش

شدن بہ بحر و گہر برنخاستن ننگ است

تو قدرِ خویش ندانی بہا ز تو گیرد

و گرنہ لعل درخشندہ پارۂ سنگ است

اُستاد غزل سعدیؒ

ہر کسے را نتواں گفت کہ صاحب نظر است

عشق بازی دگر و نفس پرستی دگر است

نہ ہر آں چشم کہ بیند سیاہ است و سپید

یا سیاہی ز سپیدی بشناسد بصر است

هر کہ در آتشِ عشق است طاقت سوز

گو بنزدیک برو کافت پروانہ پر است

گر من از دوست بنالم نفسم صادق نیست

خبر از دوست ندارد کہ ز خود با خبر است

آدمی صورت اگر دفع کند شہوت نفس

آدمی خوئے شود ورنہ ہماں جانور است

چہ از دست دلآرم چہ شیریں وچہ تلخ

بداہ اے دوست کہ مستغنی ازاں تشنہ تر است

من خود از عشق لبت فہم سخن می نہ کُنم

ہر چہ زاں تلخ ترم گر تو بگوئی شکر است

در بتیغم بزنی با تو مرا خصمی نیست

خصم آنم کہ میاں من و تیغت سپر است

پس ازیں بند نخواہم بدر آید ہمہ عمر

بند ہائے کہ بدستِ تو بود تاج سر است

علّامہ اقبالؒ

مرا ز دیدۂ بینا شکایت دگر است
کہ چوں بجلوہ در آئی حجاب من نظر است
بہ نوریاں ز من پا بہ گِل پیامے گوئے
حذر ز مشت غبارے کہ خویشتن نگر است
نوا زنیم دبزم بہار می سوزیم
شرر بہ مشت پر ماز نالۂ سحر است
ز خود رسیدہ چہ داند نوائے من ز کجا است
جہان او دگر است و جہان من دگر است
مثال لالہ فتادم، بگوشۂ چمنے
مرا ز تیر نگاہے نشانہ بر جگر است
بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
ہزار انجمن آراستند و بر چیدند

دریں سراچہ کہ روشن ز مشعل قمر است
ز خاک خویش بہ تعمیر آدمے برخیز
کہ فرصت تو بقدر تبسم شرر است
اگر تو بوالہوسی با تو نکتۂ گویم
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است
نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے ؎

سعدیا[1] دی رفت و فردا ہم چنیں موجود نیست
در میان ایں و آں فرصت شمار امروز را

علامہ اقبال نے اس خیال کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے

بگیر امروز را محکم کہ فردا ؎
ہنوز اندر ضمیر کائنات است

---

[1] سعدی کے اس شعر کا ایک انگریز ادیب نے یوں ترجمہ کیا ہے۔

To-morrow is not yesterday is spent
To day Oh! Sa'di take thy heart secure it

اردو کے اس زبان زد عام شعر کو ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علامہ مرحوم نے کس خوبی سے فارسی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی
درماں نیافریدی آزار جستجو را

فارسی کے اس مشہور شعر ؎

محمود غزنوی کہ ہزاراں غلام داشت
عشق آں چناں گرفت غلام غلام شد

کے خیال کو اقبالؔ نے نہایت لطیف پیرایہ میں پیش کیا ہے ؎

محمود غزنوی کہ صنم خانہ ہا شکست
زناریٔ بتانِ صنم خانۂ دل است

مولانا جامی کے اس شعر کو ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامیؔ
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

علامہ اقبالؔ نے یوں نغمہ سرائی کرتے ہوئے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے

دررہِ عشق فلاں ابن فلاں چیزے نیست
ید بیضائے کلیمے بہ سیاہے بخشند

بعض دلچسپ خیالات کو ہمارے شاعر نے اپنے کلام میں کئی بار دہرانے سے بھی اجتناب نہیں کیا ہے۔ جیساکہ وہ خود کہتا ہے

مرا معنئ تازہ مدعاست
اگر گفتہ را باز گویم رواست

مثلاً اس خیال کو کہ ایک آدمی کے احساسات و جذبات کو دوسرا شخص پورا پورا ادراک نہیں کرسکتا۔ علامہ مرحوم نے مختلف مقامات پر یوں بیان کیا ہے:۔

ہم نفس فرزند آدم راکجاست
ہنوز ہم نفسے در چمن نمے بینم

اس طرح مندرجہ ذیل دو شعروں میں بھی ایک ہی خیال کو جامۂ الفاظ پہنایا ہے

بیا آ بجو نگرم خویش را نظارہ کنم
بایں بہانہ مگر روئے دیگرے بینم

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جوئم

غزل سرائیم و پیغام آشنا گوئم

علیٰ ہٰذا القیاس زیرِ نظر کتاب کے مصرعہ "فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم" کے خیال کو اپنے اُردو کلام میں پہلے ظاہر کیا ہے "بانگ درا" کا آخری مصرعہ گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا۔ جواب زبان زدِ عام ہو گیا ہے۔ اسی خیال کا حامل ہے۔

"افکار"

نوائے شاعرے جادو نگارے
زینش زندگی نوشینہ سازد
(اقبالؒ)

"افکار" کی صورت میں شاعر نے اپنی چند دلآویز و مترنم نظموں کو مرتب کیا ہے۔ "نغمۂ ساربان"۔ "شبنم"۔ "نوائے وقت"۔ "سرود انجم"۔ اور "کرمک شب تاب" اقبال کی بہترین مترنم فارسی نظمیں ہیں۔ جن میں سلاست و روانی یعنی لغویتِ شعری کا امتداد یائے معانی پایا جاتا ہے کوئی ایسا شخص بھی ہوگا۔ جو ان وجد آفرین و کیفیت زا نظموں کو پڑھے اور سر نہ دھنے خود شاعر ان نظموں کے ترنم سے بہت حد تک متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکا۔ جیسا کہ اس کے ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

نغمۂ من دل کشائے　　زیر و بمش جانفزائے

قافلہ ہارا درائے　　فتنہ رُبا فتنہ زائے

نظم موسوم بہ "کرمک شب تاب" میں بے نظیر تشبیہات اس خوبی اور کثرت سے استعمال کی گئی ہیں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک سرور سا چھا جاتا ہے۔ مثلاً

پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد

بر شمع چنان سوخت کہ خود را ہمہ او کرد

ترک من و تو کرد

یا اختر کے ماہ مبینے بیکمینے
نزدیک تر آمد بہ تماشائے زمینے

از چرخ برینے

نظم "شبنم" میں روانی اور صنعت لفظی کا ایک امڈتا ہوا دریائے معانی موجزن ہے جس کے سیلِ ہمہ گیر میں الفاظ خود بخود خس وخاشاک کی طرح بہے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

انجم بہ بر ماست
لختِ جگرِ ماست
نورِ بصر ماست

در پیرہنِ شاہد گل سوزنِ خاراست
خاراست ولیکن زندیماں بہار است

از عشق نزار است
در پہلوئے یار است
ایں ہم زبہار است

برخیز و دل از صحبت دیرینہ بہ پرواز
با لالۂ خورشید جہاں تاب نظرباز

بااہلِ نظر ساز

چوں من بفلک تلمذ

"نوائے وقت" میں شاعر نے امام شافعی علیہ الرحمۃ کے مشہور زریں مقولہ "الوقت سیف" کی تشریح اپنے مختص حکیمانہ وشاعرانہ رنگ میں کی ہے امام صاحب کے مقولہ کی بہترین تشریح اس نظم کی صورت میں پائی جاتی ہے۔

اونٹ حیوانات میں سے ایک نہایت ہی بھدّا اور غیر متناسب الاعضاٗ جانور ہے۔ اس کی نسبت مشہور ہے۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ لیکن جب شاعر اس کی تعریف کرنے لگتا ہے تو اُسے دولت بیدار۔ آہوئے تاتار۔ حورِ بہشتی۔ لالۂ حمرار۔ دخترِ صحرا۔ شاہدِ رعنا سے ملا دیتا ہے اور پڑھنے والے کو یہ گمان غالب ہونے لگتا ہے کہ شاعر کسی بانکی سجیلی شہزادی کی تعریف کر رہا ہے۔ نہ کہ اونٹ سے بھدّے جانور پر شعر کہہ رہا ہے۔ یہی چیز ہے جس کو دراصل کمالِ شاعری کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دلکش و زیبا ستی

شاہدِ رعنا ستی

روکشِ حوراستی

غیرتِ لیلاستی

دخترِ صحراستی

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

لکۂ ابرِ رواں!

کشتیٔ بے بادباں

مثلِ خضرِ راہ داں

بر تو سبک ہر گراں

لختِ دلِ سارباں

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

الٰہیات کے دقیق مسائل کو دلکش نغموں میں بیان کرنا اقبالؔ ہی کا کمالِ فن ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو۔ وہ کس شان دلآویزی سے نغمہ سرائی کر رہے ہیں ؎

تو کیستی و من کیم ایں صحبت ما چیست

بر شاخ گل ایں طائرک نغمہ سرا چیست

مقصود نوا چیست ؟

مطلوب صبا چیست ؟

ایں کہنہ سرا چیست ؟

گفتم کہ چمن رزم حیات ہمہ جائی است

بزمے است کہ شیرازہ ذوق جدائی است

اقبال غلامی کے بدترین دشمن ہیں۔ وہ ایک غلام پر سُگتّے کو ترجیح دیتے ہوئے نوا سنج ہوتے ہیں ؎

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد جم کرد

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد

اشرف المخلوقات کی اس افتادگی و زبوں حالی سے متاثر ہو کر ایک اور جگہ وہ اپنے اشہب تخیل کو یوں جولاں کرتے ہیں ؎

تا کُجا در تہ بال دگراں می باشی

در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

حکیم مشرق نہ صرف غلامی کے بدترین دشمن ہیں۔ بلکہ مغربی جمہوری[1] طرز حکومت کے بھی خلاف ہیں ؎ (حاشیہ صہ ۷۶ پر)

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمے آرد

شعر کی تعریف

ہر شاعر و حکیم نے شعر و حکمت کی تعریف اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے ان ہر دو چیزوں کی تعریف کو کس خوش اسلوبی سے ایک ہی شعر میں سمویا ہے ؎

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

(حاشیہ صفحہ ۷۵ کا)

لہ اپنے اُردو کلام میں بھی اس مسئلہ پر انہوں نے علانیہ رائے زنی کی ہے ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو..... ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

شاعر کا علوِّ تخیل

قرآنی قصّۂ انکارِ ابلیس و اغوائے آدم کو شاعرِ مشرق نے کس اختصار مگر پُرکاری سے بیان کیا ہے ؎

جرمِ ما از دانہ تقصیر او از سجدہ
نے بہ آں بے چارہ می سازی نہ باما ساختی

ہندوستانیوں کی ایمانی برودت سے حکیم مشرق کو شکوہ ہے ؎

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

اخلاقیات کے بعض مسائل

حکیم مشرق نے "بعنوان زندگی" چند اشعار لکھ کر زیست انسانی کے دو متضاد نظریات یعنی "زندگی ہے مرثیہ" اور "زندگی ہے قہقہہ" کو یکجا کر دیا ہے۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شبے زار نالید ابرِ بہار — کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است

درخشید برق سبک سیر وگفت خطاکردہ ئی خندہ ئی یکدم است

Epicuzean school of thoug ıt

اس گروہ کے مفکروں کی رائے ہے ۔

ہرچہ داری بخور امروز و غم دہر مخور

چوں بفردا برسی روزئی فردا برسد

ایران کے فلاسفۂ قدیم میں عمر خیام اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔

اقبالؔ اور مسئلۂ خودی

"بیا اقبالؔ جامے از خمستانِ خودی درکش
تو از میخانۂ مغرب ز خود بیگانہ مے آئی"

(اقبالؔ)

"خودی" اقبال کا خاص موضوع سخن ہے۔ اگرچہ اس مبحث پر علامہ مرحوم نے ایک علیحدہ جامع کتاب بعنوان "اسرار خودی" "رموزِ بیخودی" تصنیف فرمائی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ کچھ اتنا ان کے دلنشین ہے کہ وہ اپنے دیگر مجموعۂ کلام میں بھی اس کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ زیر نظر کتاب "پیام مشرق" میں بھی جا بجا انہوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، وہ ایک جگہ یوں گویا ہیں ؎

تو قدرِ خویش نہ دانی بہاز تو گیرد | وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

تعمیر خودی کی نسبت وہ پرزور الفاظ میں ببانگ دہل کہتے ہیں ؎

خُودی تعمیر کُن در پیکرِ خویش | چو ابراہیم معمارِ حرم شو

دیگر اصناف سخن کے علاوہ سلاطین و امرائے وقت کی قصیدہ گوئی سے مشاہیر شعرائے فارس کا کلام سراسر مملو ہے۔ برعکس اس کے حکیم مشرق جو بادۂ خودی سے مخمور و سرشار تھے۔ آستان بوسی شاہان و خوشامد کو وجہ ننگ و عار خیال کرتے تھے۔

دل بحق بند وکشا دے زسلاطین مطلب   کہ جبیں بر در ایں بتکدہ سودن نتواں

اُن کے کردار کے اس پہلو کا تذکرہ خود اُن کی زبانی ذرا سنیئے ؎

نازِ شہاں نمی کشم، زخمِ کرم نمی خورم   در نگر اے ہوس فریب ہمّتِ ایں گدائے را

خودی کے عناصر کو نیست و نابود کر کے فنا فی الشیخ و فنا فی الرسول و فنا فی اللہ کے مراحل طے کرنے کے بعد انسان کہیں جا کر منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ اکثر صوفیائے کرام کا یہی مسلک رہا ہے۔ لیکن اقبالؒ اس کے برعکس مئے خودی سے سرخوش و سرشار ہو کر منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ نہ صرف چاہتے ہیں بلکہ افضل تر خیال کرکے کہتے ہیں ؎

زمن گو صوفیانِ باصفا را   خدا جویانِ معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم   کہ بانورِ خودی بیند خدا را[1]

مثنوی اسرارِ خودی میں علامہ نے ایک مقام پر کہا ہے ؎

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند   ہستئ بے مایہ را گوہر کند

انھوں نے اس خیال کو "پیام مشرق" میں بار دیگر یوں بیان کیا ہے ؎

چو تاب از خود بگیرد قطرۂ آب   میانِ صد گہر یک دانہ گردد

اس مثال سے ظاہر ہے کہ علامہ خودی کے مسئلے سے اتنے متاثر تھے کہ وہ ایک خیال کو بار بار مختلف الفاظ میں بیان کرنا بھی ناگوارِ خاطر نہیں سمجھتے تھے۔

---

[1] مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

"نقشِ فرنگ"

"نام نیکِ رفتگان ضائع مکُن
تا بماند نامِ نیکت برقرار"
(سعدیؒ)

"نقشِ فرنگ" میں جو اشعار علامہ نے جمع کیے ہیں۔ اُن میں سے اکثر مشاہیر شعرائے عالم و فلاسفہ سے اپنے مختص حکیمانہ و شاعرانہ رنگ میں انہوں نے لکھے ہیں۔ مجھے ان کے وہ اشعار جو پٹوفی شاعر جوانا مرگ ہنگری کی یادگار میں لکھے ہیں۔ بہت پسند آئے ہیں۔ پٹوفی کی نعش میدان کارزار میں دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اس کے ابنائے وطن اس کی کوئی یادگار نہ بنا سکے۔ لیکن شاعر مشرق کی جدّتِ بیانی ملاحظہ ہو۔ کہ وہ اُس کے کلام ہی کو اس کا مدفن قرار دیتے ہیں اور یہ وہ رفعتِ تخیل ہے کہ جہاں تک کسی شاعر کا طائرِ فکر اب تک پرواز نہ کر سکا۔ ان اشعار پر بلاشک "بملکِ جم ندہم مصرعہ نظیری را" کا اطلاق ہو سکتا ہے ان اشعار کو صرف اشعار کہنے سے ان کی قدر و منزلت کم ہو جاتی ہے میرے نزدیک یہ عقیدت کے چند خوش نما پھول ہیں۔ جو ایک مشرقی شاعر اپنے ایک ہم مشرب مغربی شاعر کے خیالی مرقد پر چڑھا رہا ہے:-

نفسے دریں گلستاں ز عروسِ گُل سرودی ‏ بدلے غمے فرو دی ز دلے غمے ربودی

تو بخون خویش بستی کف لالہ رانگارے | تو بہ آہ صبح گاہی دلِ غنچہ راکشودی
بنوائے خودگم استی سخن تو مرقدِ تو | بہ زمیں نہ بازرفتی کہ توازز میں نہ بودی

"شاعری جزو لیست از پیغمبری"[1]

"شاعری جزو بیست از پیغمبری" کا مقولہ اگر ہمارے دور گذشتہ کے شعراء میں سے کسی کے کلام پر صادق آسکتا ہے تو وہ یقیناً اقبال کی شاعری ہے آج سے ستیس تینتیس سال پیشتر جبکہ حکمائے فرنگ نے جمعیت الاقوام کا سنگِ بنیاد رکھا۔ تو ظاہر بیں نگاہوں کے لئے اس کا وجود سراپا رحمت نظر آیا تھا لیکن اقبال جن کی دور رس نظر کے آگے کوئی حجاب زندگی باقی نہ رہا تھا اور جو مزاجِ[2] لالۂ خودرو تک سے واقف ہو چکے تھے۔ اس جماعت کی حقیقت کو کس خوبی سے بھانپ گئے تھے۔

ا؎ کہہ گئے ہیں شاعری جزو لیست از پیغمبری
ہاں سنادے محفلِ ملّت کو پیغام سروش (بانگِ درا)

۲؎ مزاجِ لالۂ خودرو شناسم
بشاخ اندر گلاں رابو شناسم (اقبال)

جمعیّت الاقوام[1]

برفت تا روش رزم دریں دہر کہن
دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس دعویٰ کی تائید مولانا گرامی جیسے مقتدر شاعر نے بھی یوں کہہ کر کی ہے۔ شعر

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت (گرامیؔ)

نطشہ کے افکارِ باطل سے اختلاف

نطشہ کے افکار باطل قرار دیتے ہوئے علامہ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے مصرعہ "قلب او مومن دماغش کافر است" اپنے اُردو کلام میں

---

[1] بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ میرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے
(ضربِ کلیم)

بھی انہوں نے مغرب کے اس منکرِ خدا فلسفی کی نسبت لکھا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

لارڈ بائیرن کی شخصیت کا اعتراف

تمام شعرائے انگلستان میں سے علامہ اقبالؒ صرف لارڈ بائیرن کی شخصیت سے بہت حد تک متاثر ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہی ایک شاعر ہے جس کا تذکرہ زیرِ نظر تصنیف "پیامِ مشرق" میں پایا جاتا ہے۔ دراصل برِّاعظم یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی بائیرن اپنے دیگر ہموطن شعراء سے زیادہ مشہور و مقبول ہوگیا ہے۔ کیوں کہ اس کے کلام میں انقلابی روح کارگر ہے پچھلی صدی میں یُورپ کی تحریک آزادی میں اُس کے افکار دخیل رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے بعض اشعار کو سمجھنے کے لئے نہ صرف ملکۂ سخن فہمی

"Blood will be shed like water and tears like mist, but peoples will conquer in the end"
(Byron)

ہی مکتفی ہے۔ بلکہ مشرقی اور مغربی شعراء و ادبا اور فلاسفہ کے افکار و حالات سے گہری واقفیت اور مطالعہ کی ضرورت بھی پڑتی ہے کیوں کہ اُن کے ایک ایک فارسی شعر میں ایک ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ مثلاً جب ہم ان کا یہ شعر بائرن کی نسبت پڑھتے ہیں ؎

نبود در خورِ طبعش ہوائے سرد فرنگ
تپید پیک محبّت ز سوز پیغامش

تو انگلستان کے مشہور جارج گورڈن لارڈ بائرن کی تمام سوانح حیات کی یاد ہمارے دماغ میں تازہ ہو جاتی ہے کہ کس طرح اُس نے ترکِ وطن کیا اور تحریکِ آزادی یونان میں حصّہ لیتے ہوئے اپنے وطن سے دور جزیرہ ایونا میں سپردِ خاک ہوا۔ اگرچہ یونانیوں نے کما حقہٗ اس شاعر کی قدر و منزلت نہ کی۔

"خردہ"

زیرِ نظر تصنیف کا آخری حصّہ "خردہ" کا یہ شعر۔

چشم را بینائی افزاید سہ چیز
سبزہ و آب رواں و روئے خوش

ہمیں مغل شہزادی کے اس دل نشین شعر کی یاد دلاتا ہے ؎

چہار چیز ز دل غم برد کدام چہار
شراب و سبزہ و آب رواں و روئے نگار

گوئٹے اور اقبالؒ

گر گلشنِ مغرب میں نوا ساز ہے کوئی
مشرق میں بھی تو زمزمہ پرواز ہے کوئی

(اشرف)

"One man's word is no man's word
justice demands that both be heard" (Goethe)

گوئٹے اور اقبالؒ

اقبالؒ اور گوئٹے کے بعض حالات و طبائع میں بہت حد تک یگانگت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں عظیم المرتبت و اولوالعزم شعراء نے قانون کو بطور پیشہ اختیار کیا اور دونوں نے قانونی موشگافیوں سے بالکل قطع تعلق کر کے شعر و سخن میں زندگی کا لطف اٹھایا۔ گوئٹے کی آزاد شاعرانہ طبیعت قانون کی کڑی پابندی سے یکسر متنفر ہو چکی تھی اور علامہ اقبالؒ باوصف اپنی فطری ذہانت ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے نہ چمک سکے اور اپنے آخری ایام میں ہمہ تن شعر و سخن میں منہمک ہو گئے تھے۔ ان دونوں تلامیذ الرحمٰن نے لسان الغیب خواجہ حافظؒ کے وجد آفریں و کیف آور سرمدی نغموں سے نہ صرف لطف اٹھا کر اپنی روحوں کو بالیدگی اور دلوں کو وجدان بخشا۔ بلکہ ان کی دلنشین تراکیب و اسالیب بیان کو بھی اپنے اپنے کلام میں جابجا اختیار کیا۔ ان دونوں شعراء کو قدرت نے اپنے افکار و شاہکارات مجتمع

Laws are a fatal heritage and like a disease they trail from generation to generation

(Goethe)

کرنے کے مواقع بخشے۔ اور طویل عمریں عنایت کیں۔ اقبالؔ سنِ مسنون[1] کو پہنچ کر اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے اور گوئٹے تیاسی سال کا تھا۔ جب کہ اس کا تن خاکی سپردِ خاکِ دیمیر[2] ہوا۔

ان دونوں مشاہیر کا انجام بالخیر ہوا اور اپنے آخری لمحات میں بھی اپنی عظمت کا ثبوت بہم پہنچا گئے۔ اقبالؒ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ موت سے دس منٹ پہلے انہوں نے یہ بے نظیر قطعہ کہدیا تھا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ۔۔۔ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے ۔۔۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور گوئٹے کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ موت سے ذرا پہلے اس کے لب پر یہ آخری الفاظ جاری تھے "کچھ اور روشنی"۔ ہمیں یہاں کرشن کے اس قول کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ کہ "موت کا وقت تمام زندگی کی عادات کا نتیجہ ہوتا ہے"۔

---

[1] سن مسنون اُس عمر کو کہتے ہیں۔ جس کو پہنچکر رسول اللہ صلعم عالم جاودانی کو سدھارے تھے یعنی ۶۳ سال کی عمر۔

[2] گلشنِ دیمیر میں ترا ہم نوا خوابیدہ ہے
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
(بانگ درا)

بائیرن کے تخیلات کو ان دونوں مشاہیر شعراء نے اپنے نغمات شیریں میں سراہا ہے۔ اقبالؒ کی رائے بائرن کے متعلق تو ہم آگے بیان کر آئے ہیں۔ گوئٹے نے ۱۸۲۳ء میں بائیرن سے جبکہ وہ جنیوا چلا گیا تھا ایک نظم لکھی تھی۔

ان دونوں مشاہیر شعراء نے اپنے بہترین شاہکارات و نغمات کلام الٰہی سے اخذ کئے ہیں۔ اقبالؒ کے بارے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کہ انھوں نے قرآن حمید سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے اور قرآنی قصص، انکار ابلیس واغوائے آدم کو زبانِ شعر میں ادا کیا ہے۔ گوئٹے انجیل مقدس سے بہت حد تک فیضیاب ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا بہترین شاہکار ڈرامہ فوسٹ جس میں اس نے اپنا کمال فن دکھایا ہے۔ کلام الٰہی کا مرہون منّت ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے اگر اقبالؔ نے گوئٹے کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے تو موخرالذکر نے شیکسپیئر کے کمال کے آگے نہ صرف زانوئے ادب تہ کیا ہے بلکہ اس نے اپنے کئی نغمات شیریں کی تاسیس انگلستان کے اس مایۂ ناز شاعر کے افکار پر رکھی ہے۔ چنانچہ شیکسپیئر کی عظمت کے آگے سرنگوں ہوتے وہ خود لکھتا ہے۔

"شیکسپیئر کی عظمت کو جرمنوں نے دوسری اقوام عالم سے زیادہ تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اس کی اپنی قوم سے بھی زیادہ۔ ہم لوگوں نے اس کے معاملہ بس اتنا انصاف کیا ہے کہ ہم نے خود اپنے ساتھ نہیں کیا ہے۔ مشاہیر نے اُسے بہترین صورت میں پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اور میں نے خود ہمیشہ اُس کی پرزور تائید کی ہے۔ میں نے بوضاحت اُن تاثرات کو بیان کیا ہے جو اس غیر معمولی دماغ کے مجھ پر پڑ گئے ہیں اور اُس کی تصانیف پر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ جو پسند عام ہو گئی ہے"۔

ان دونوں مشاہیر نے اپنے اپنے قدما سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ اقبالؒ نے حافظؒ و سعدیؒ اور مرشدِ رومیؒ کے فیض سے عروسِ سخن کو آراستہ کیا تو گوئٹے نے شیکسپیر۔ ہومر اور سپانیوزا کے مطالعہ سے وسعتِ نگاہ حاصل کی۔

ان دونوں مفکرین نے اپنی تعلیمات میں عملی زندگی کی تلقین کی ہے

اقبال نے تو ہمیں صاف صاف کہہ دیا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

چنانچہ زیرِ نظر تصنیف میں "جہانِ عمل" کے تحت وہ لکھتے ہیں ؂

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمت[1] بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا
اے کہ تو پاسِ غلط کردۂ خودی داری
آنچہ پیشِ تو سکون است خرام است اینجا
ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم
علم را جاں یدمیدیم و عمل ساختہ ایم

گوئٹے رقمطراز ہے کہ آدمی صرف غور و فکر سے اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا ہے بلکہ خود شناسی عمل سے آجاتی ہے۔ اگر ڈرامہ فاوسٹ کی نسبت کسی کا یہ اظہار ہے کہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی شاہکار ہے تو میرا یہ کہنا کہ بیسویں صدی میں مثنوی "اسرارِ خودی" و "رموزِ بیخودی" لکھ کر علامہ اقبالؒ نے اپنا شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جو یورپ کے شعراء و ادبا سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکا

---

[1] بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا (غالب)

ہے مبالغہ آمیز نہ ہو گا۔

ان دونوں خوش نصیب شعرار کی اپنے اپنے وقت کے شہزادگان نے قدر و منزلت کی۔ گوئٹے کو ڈیوک آف ڈیمیر نے اپنا وزیر اعظم بنایا۔ تو اقبالؒ نے اپنی زندگی کے چند ایام شیش محل بھوپال میں گذارے۔

اقبالؒ نے گوئٹے کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے۔ جس کو یہاں درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی　　آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی
بست نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ　　داد مشرق را پیامے از فرنگ
در جوابش گفتہ اَم پیغامِ شرق　　ماہ تابے ریختم بر شامِ شرق
تا شناسائے خورم خود بیں نیم　　با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثلِ برق　　شعلۂ من از دمِ پیرانِ شرق
او چمن زادے چمن پروردۂ　　من دمیدم از زمینِ مردۂ
او چو بُلبُل در چمن فردوسِ گوش　　من بصحرا چوں جرس گرمِ خروش
ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات　　ہر دو پیغامِ حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام　　او برہنہ من ہنوز اندر نیام

ہر دو گوہر ارجمند و تابدار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہِ قلزم تپید — تا گریبانِ صدف را بردرید
من بآغوشِ صدف تابم ہنوز
در ضمیرِ بحر نایابم ہنوز

گوئٹے کے کمالِ فن کا اعتراف

زیرِ نظر تصنیف "پیامِ مشرق" میں علامہ اقبالؒ نے المانوی شاعر اعظم کے کمالِ فن کا اعتراف جا بجا کیا ہے اور اس کا ذکر جہاں کہیں بھی آیا ہے۔ نہایت عقیدت[۱] اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ دیگر مشاہیر و فلاسفہ پر چوٹ کرتے ہوئے وہ دریغ نہیں کرتے۔ جیسا کہ حکیم نطشہ[۲] اور افلاطون[۳] یونان کا انہوں نے مضحکہ اڑایا ہے لیکن گوئٹے کے افکار نہ صرف اُن کو پسند آئے

۱۔ صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں — کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

۲۔ نطشہ کے بارے میں پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ افلاطون کے افکار کو باطل قرار دیتے ہوئے علامہ نے فرمایا ہے۔

۳۔ راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم

بلکہ اس کی نظموں کو خود ترجمہ کرکے انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام میں شامل کرلیا ہے۔

چنانچہ زیرِ نظر تصنیف میں گوئٹے کے بہترین ادبی شاہکار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "اس ڈرامے[1] میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آسکتا۔"

پاکستان و ہندوستان اور ایران کے شعراء میں جہاں تک میرا علم ہے اقبالؒ مرحوم نے ہی مغرب کے اس مفکرِ اعظم کے افکار سے ان ممالک کو اُسی طرح روشناس کرایا ہے۔ جس طرح کارلائل نے انگلستان کو اُس سے

---

[1] گوئٹے کے اس مشہور ڈرامے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے اس کا آغاز تب کیا تھا۔ جب کہ وہ سٹراس برگ دارالعلوم میں ایامِ شباب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور تب جا کر ختم کیا جس وقت وہ اپنی عمر کے بیاسویں سال سے گذر رہا تھا۔ یعنی اپنی موت سے صرف ایک سال پیشتر۔ اس ڈرامہ کا پہلا حصہ عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرا حصہ تمثیلات و صنائع و بدائع سے لبریز ہے۔

متعارف کرایا تھا۔

گوئٹے کے کمالِ فن کا نہ صرف علامہ اقبالؒ گرویدہ ہیں۔ بلکہ ایک عالم عقیدت کے بے شمار خوشنما پھول اس شاعر کے ہمہ گیر تخیل کے نذر کر چکے ہیں۔ کارلائل جیسا عالم و فاضل شخص بھی اس عظیم المرتبت المانوی کے افکار پر والہ و شیدا تھا۔ لیکن سب سے بڑھ چڑھ کر گوئٹے کے نغمات کی اگر کسی شخص نے تعریف کی ہے۔ تو وہ اس کا ہمعصر اور ہموطن شاعر غزل گو ہائنا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "اس وقت اقوام عالم سیاسی امورات میں ہمہ تن مصروف ہیں جب سیاسی بحران اُتر جائے اور ہم سب جرمن، برطانوی، ہسپانوی فرانسیسی اور اطالوی مل کر کسی سبزہ زار میں جا کر نغمہ سرائی کریں۔ ربُبل کو اپنا منصف قرار دیں تو مجھے یقین کامل ہے کہ اس مقابلہ میں گوئٹے کا نغمہ ہی مستحق انعام و اکرام قرار دیا جائے گا۔"

علامہ اقبالؒ کی نظم "جوئے آب" گوئٹے کے دلکش زمزمہ موسوم "یہ نغمہ محمد" کا آزاد ترجمہ ہے اس نظم کے بارے میں خود گوئٹے رقمطراز ہے "اس ڈرامے کے خاکے نے میرے دماغ کو اپنی طرف بہت مدت تک لگا رکھا کیونکہ میں حسب عادت لکھنے سے پہلے اس خیال کو نشوونما پانے کا موقعہ دے

رہا تھا کہ فطانت ایک اعلیٰ کردار اور قوی دماغ کے ساتھ بنی نوع آدم پر جس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے اور وہ جن فوائد و نقصانات کی متحمل ہو سکتی ہے، کہ منتہائی طریق پر ظاہر کروں۔"

گوئٹے کا ہمہ گیر تخیّل

گوئٹے کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہ صرف شعر و سخن کے میدان ہی میں اپنے اشہب تخیل کو دوڑایا ہے بلکہ دیگر علوم و فنون پر بھی سیر حاصل تبصرہ جات کیے ہیں خصوصاً اپنے وقت کی دنیائے سائنس میں اس کے انکشافات کی سب سے زیادہ قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ نباتات و جمادات و حیوانات میں اس کے انکشافات[1] کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے۔

گوئٹے کو اپنے دیگر علمی کارناموں پر ناز تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ایک دوست کو اپنے شعر و سخن کی نسبت یہ رائے ظاہر کی تھی "جو کچھ میں نے بحیثیت ایک شاعر حاصل کیا ہے میں اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ گوئٹے نے (intermaxillary) ہڈی کا انکشاف اور اسے Science of Morphology کا بانی بھی مانا گیا ہے

لیکن مرزا اسد اللہ خاں غالب کی طرح جنہوں نے اپنے تمام اوقات کو فارسی شعر و ادب کی خدمت میں گذارا۔ بالآخر اردو کے شاعر ہی کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ گوئٹے کا نام بھی آج دنیا میں صرف اس کے بے نظیر نغمات شیریں کی وجہ سے زندۂ جاوید ہے۔

یہاں ہمیں اس امر کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ گوئٹے کے جوہرِ پنہاں کیا تھا۔ عیاں کرنے کے لئے بہت سی سہولتیں بہم تھیں۔ جو اقبالؒ کو نصیب نہ ہوئیں۔ یہاں تک کہ اپنے افکارِ عالیہ کے اظہار کے لئے انہیں فارسی غیر ملکی زبان کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

ادب برائے ادب کے بارے میں گوئٹے کا مطمحِ نظر

علامہ اقبالؒ کا مطمحِ نظر ہم آگے بیان کر چکے ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس مبحث پر صرف چند اشعار کے ذریعے اپنے خیالات کو جامۂ اظہار پہنایا ہے لیکن گوئٹے نے نہ صرف اپنے اشعار میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے بلکہ ایک دلچسپ ڈرامہ بعنوان "ادب برائے ادب" کے متعلق اظہار حقیقت" لکھ کر اپنے افکار کو بالتفصیل بیان کیا ہے تفصیلات سے قطع نظر

کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بہت حد تک اس مسئلہ پر گوئٹے کے افکار اقبالؒ کے تخیلات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ گوئٹے خود رقمطراز ہے

"جو شخص کسی نصب العین کو مدِ نظر رکھ کر کوشش کرتا ہے اس کی محنت بار آور ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص ادب کے خیال سے سعی کرتا ہے وہ اپنے کام میں بالکل ناکامیاب رہتا ہے۔ اگر آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے اس کا کام معیار پر پورا نہ اُترے"۔

"احیائے ادب" کے بارے میں گوئٹے لکھتا ہے:۔

"وہ دورِ ادب حقیقت میں بہت غنیمت ہے۔ جس میں ماضی کی بڑی بڑی تصانیف روشنی اور اشاعت عام میں لائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ اس سے ایک نیا اثر پیدا ہوتا ہے"۔

گوئٹے کے قومی تعصّبات و امتیازاتِ نسلی

جرمن قوم کی سرشت ہی میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ امتیازات نسلی و قومی سے بالاتر نہیں جا سکتی ہے۔ اُس کی یہ کور بینی دنیا کے امن و امان کو کئی بار تہ و بالا کر چکی ہے اور کئی مرتبہ اُس نے خون کی ندیاں بہا دی ہیں اور آج

اقوامِ عالم کے سامنے ایک بے دست و پا اپاہج کی طرح اس شریر قوم کے بچے انصاف کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ جرمن قوم کا مایۂ ناز شاعرِ اعظم گوئٹے کا طائرِ فکر بھی باوصف اپنی فطری ذہانت و فطانت قومی اور مذہبی تعصّبات سے بالاتر پرواز نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "مسلمانوں کی طرف سے کافروں کی توہین اور ہماری قوم کے غلاموں کے ساتھ ان کا ناروا سلوک اس قابل ہے کہ ہم اُن سے نفرت کریں۔ اور انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیں۔" ملاحظہ ہو اُس مفکرِ اعظم کا قومی اور مذہبی تعصّب جس کے افکار پر مغربی دنیا کو ناز ہے۔

علیٰ ہٰذالقیاس علم و ادب اور دیگر اصنافِ فنونِ لطیفہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ کہتا ہے "کاش ادبِ عالیہ کی بنیادیں یونانی اور رومن لٹریچر کی سطح ہی پر کھڑی کر دی جاتیں۔ چینی۔ ہندی اور قدیم مصری ادبیات بجز استعجاب انگیز ہونے کے اور کچھ نہیں۔ دُنیا کو اُن سے روشناس کرنا قابلِ قدر ہے۔ لیکن ان سے ہمارے اخلاقی نظام اور فنونِ لطیفہ کے کلچر کو کسی قسم کی استعانت نہیں مل سکتی۔" گوئٹے کے ان فرسودہ خیالات کے برعکس اقبالؒ زیرِ نظر تصنیف "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں

لکھتے ہیں "اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایک ایسی کوشش جس کا مقصد افراد اور اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو۔ قابلِ احترام ہے۔" بقول حافظؒ ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

---

(۱) حالاں کہ یہ اظہار رائے خلافِ حقیقت ہے۔ سیّد عباس حسینی ایم۔ اے ناول کا تذکرہ کرتے ہوئے یونانی ادب کے بارے میں بحوالۂ انسائیکلو پیڈیا Encyclopaedea Britanice لکھتے ہیں "سکندر سے پہلے کا مغربی ادب یونان کی پیداوار ہونے پر بھی مشرقی ادب سے متاثر ہے۔ لیکن سکندر کے بعد کا محض نقالی ہے۔ یونانی شاعر کا ادبی چشمہ خشک ہو گیا تھا اور تیسری صدی سے نئی مفتوح قوم نے جس کا مرکز خیال سکندر تھا۔ اس تخیّل کا اظہار جو کہ رزمیہ نظموں میں درج تھا۔ کی جگہ ناول کو کیا۔ یعنی ہماری مشرقی مے یونان میں دو آتشہ بن کر مغرب کے میخانوں میں پہنچی اور تشنہ کاموں کو سیراب کیا۔ پنج تنترہ۔ بدپائی کی کہانیاں ہم سے لی گئیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ موسو چپاں فرانسیسی محقق و عالم مُصر ہے کہ رومان یونان میں مشرق سے آیا اور وہیں سے اطالیہ و ہسپانیہ میں پھیلا۔ چنانچہ Arbiter اور (Petronales) کے اکثر قصص مشرقی زبانوں میں سے لئے گئے ہیں۔

بایں ہمہ بعض متعصّب نقاد آنکھوں پر تعصّب کی پٹی باندھ کر اقبالؒ کی شاعری کو صرف فرقہ وارانہ قرار دے رہے ہیں۔ حالاں کہ شاعرِ مشرق ببانگِ دہل کہہ گیا ہے ؎

من اوّل آدم بے رنگ و بوئم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

ایسے اشخاص کو بقول اقبالؒ اور کیا کہا جاسکتا ہے ؎

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

گوئٹے کے بعض قابلِ قدر افکار عالیہ

گفت خدا حکمت است خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر (اقبالؒ)

جس طرح اقبالؒ نے اپنے کوزۂ "لالۂ طور" میں اسرارِ زندگی کا ایک بحرِ بے کنار بند کر دیا ہے۔ اُسی طرح گوئٹے اپنے افکار میں حقائق و معارف حیات کے بے بہا موتی رولتا ہے اور کہیں کہیں اس کے تخیلات ہمارے

مذہب اسلام کے ارشادات سے ملتے ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں آیا ہے کہ اعمال[1] کا دارومدار صرف نیتوں پر ہے ہر شخص کے لئے اُس کی نیت کا عوض مقرر ہے۔ گوئٹے اس آئین کو یوں پیش کرتا ہے "انسان کے افعال میں جیسا کہ فطرت کے افعال میں اصل شے جو لائق توجہ ہے۔ وہ صرف نیت ہے"

میرے علم میں اس حدیث شریف کی بہترین مثالیں ہمیں چنگیز خاں، ہلاکو خاں، صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ ثانی کی زندگیوں میں ملتی ہیں۔ ان چاروں جابر اشخاص نے ابنِ آدم کا خون پانی کی طرح بہایا ہے۔

لیکن دنیا کے سامنے اوّل الذکر ہر دو اشخاص بے رحم قتّال و قصّاب ہیں۔ تو مؤخر الذکر بہادروں کے کارنامے اُن کی اپنی اپنی قوم کے لئے سرمایۂ فخر ہیں۔ اور وہ "مردِ غازی" و "شیر دل" کے القاب سے تاریخ میں یاد کئے جاتے ہیں۔ یہاں فرق صرف نیت کا ہے چنگیز خاں اور

---

[1] اَلْاَعمَالُ بِالنِّیَّاتِ

Richard Coeur-de-Lion

ہلاکو خاں نے اپنے حرص و ہوا کی آگ کو بجھانے کے لئے اپنی خونچکاں تلوار دل کو بے نیام کر کے متمدّن ممالک پر ڈاکہ ڈال کر خون کی ندّیاں بہادیں نوغازی صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ شیر دل نے اپنی اپنی قوم اور ملک کی حفاظت اور مدافعت میں اپنے گھوڑوں کے پاؤں کے نیچے ہزاروں گردنیں روند ڈالیں۔

گوئٹے ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہم اپنی خواہشات کی مصروفیتوں اور کوششوں کو متوازن رکھیں۔ ورنہ ہماری مثال نباتات کے ان پودوں کی سی ہوگی جنہیں ماہرین علم نباتات ناممکل[1] قرار دیتے ہیں۔

بعض مقامات پر شیکسپیئر کے تخیلات سے گوئٹے کے افکار ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر اس سے صدیوں پہلے جذبۂ احسان[2] فراموشی کی مذمت کرتے ہوئے کہہ گیا ہے۔

چلی چل اے بادِ خنک زمستاں! تجھ میں اتنی سردی نہیں۔ جتنی

---

1. Incomplete plants
2. Blow, Blow thou winter wind
Thou art not so unkind,
As man's ingratitude
Poetry and truth

ایک احسان فراموش انسان میں ہوتی ہے۔ گوئٹے اسی خیال کو اپنے رنگ میں یوں کہتا ہے۔

"احسان فراموشی ایک قسم کی کمزوری ہے۔ میں نے آج تک کسی اصلی قابلیت کے ایسے مالک کو نہیں دیکھا۔ جو احسان فراموش ہو"

مناظرِ قدرت کی نسبت اظہارِ خیال کرتے ہوئے المانوی حکیم حیات اپنی سوانحعمری موسوم بہ "شاعری اور حقیقت"¹ میں لکھتا ہے۔

"زندگی کی تمام مسرّتوں کا انحصار مناظرِ قدرت کی باقاعدگی پر ہے۔ تبدّلِ روز و شب اور تغیرات بہار و خزاں اور گل و ثمر اور ایسی دیگر بار بار آنے والی نعمتیں ہیں۔ جن سے ہمیں صحیح معنوں میں متمتع ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہماری خاکی زندگی کی مسرّتوں کے یہی سرچشمے ہیں۔ اگر ہم مادرِ فطرت کے ان مناظر سے قطع تعلق کر کے مستفید نہ ہوں۔ تو پھر نہایت برُے تاثرات ہم پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اور ہم زندگی کو اجیرن سمجھنے لگتے ہیں"

اپنی خودنوشت سوانحعمری میں گوئٹے نے جہاں مختلف احساسات اور جذبات کو بلند انداز میں بیان کیا ہے۔ وہاں فطرتِ انسانی کے حقائق کو نہایت لطیف پیرایہ میں بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام

(نوٹ ص۱۱۱ پر)

پر وہ لکھتا ہے:۔

"رفاقت محبّت اور اخوت۔ کیا انھیں خود نہیں سمجھا جا سکتا ہے؟
ان جذبات کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اپنے ایک محبّ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

"ہم نوجوان عورتوں سے محبّت اُن کی صورت اور سیرت کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن نوجوان مردوں سے اُن کے شاندار مستقبل کی وجہ سے اُلفت کی جاتی ہے۔"

تاثرات مذاہب کے بابت گوئٹے نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ وُہ لکھتا ہے۔ تمام مذاہب اپنے عہد اوّلیں میں اپنے پورے شباب پر ہوتے ہیں۔ اس لئے بانیان مذاہب کے وقتوں کی طرف رجوع کرنا مفید اور مسرت بخش ہوتا ہے۔ کیوں کہ اُن اوقات میں ہر ایک چیز اپنی ترو تازگی اور خالص روحانیت میں ہی نظر آیا کرتی ہے۔"

گوئٹے کے مندرجہ ذیل الفاظ جو اس نے اپنی خود نوشت کتاب

"Priendship, love and brotberbood
Are they not self-understood?" (Goethe)

زندگی کے خاتمہ پر درج کیے ہیں۔ اتنے شاندار ہیں کہ انھیں آبِ زر سے بھی لکھا جائے تو کم ہے۔" وقت کے گھوڑوں کو غیبی فرشتے تازیانہ لگا رہے ہیں۔ اور وہ ہماری منزل قسمت کی طرف زندگی کی گاڑی کو تیزی سے چلا رہے ہیں۔ ہمیں صرف لگام کو جرأت اور مضبوطی سے تھامے رہنا ہے۔ اور پہیوں کو کبھی دائیں کبھی بائیں۔ کہیں سنگِ راہ سے تو کہیں نشیب و فراز سے بچانا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس کی قسمت اُسے کہاں لیے جا رہی ہے۔ جب اُسے یہ یاد نہیں۔ کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔"

ا؎ جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں!!

سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

The wheel of destiny

moves towards a goal

GOVT. COLLEGE FOR WOMEN
TEXT BOOK LIBRARY
Acc No. 571
Date 14/5/65
SRINAGAR.